دہشت گردی کا مقابلہ کیسے کریں؟: ایک مختصر تبصرہ•

ڈینیل بائمان*

ترجمہ: محمد طیب خان

طالبان کا تختہ الٹنے اور القاعدہ کے مقابلے میں پولیس سمیت خفیہ ایجنسیوں کی ایک مؤثر عالمگیر مہم کے آغاز کے بعد مزید کوئی ایسے واضح اقدامات نہیں جو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اٹھائے جائیں۔ یوں تو شاید القاعدہ خود دفاعی پوزیشن پر ہو مگر بہت سے مبصرین اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ نظریہ جس کی القاعدہ علمبردار ہے، گیارہ ستمبر کے بعد سے زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔ ہم خفیہ ایجنسیوں، وطن کے دفاع اور فوج کے لیے دولت کی فراہمی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ طور پر یہ اخراجات دہشت گردی کے موجودہ اڈوں کو ناکام بنانے کے لیے کیے جا رہے ہیں۔ لیکن محض زیادہ جاسوسوں اور بہتر دفاعی اقدامات سے دشمن نظریے کو شکست دینا مشکل ہے۔

امریکہ کو ان روایتی ہتھیاروں سے آگے بڑھنے اور جس نظریاتی تحریک کا ہم سامنا کر رہے ہیں اسے شکست دینے کے لیے طویل المیعاد خصوصی منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ ہم باتیں اور مباحثے بہت کرتے ہیں۔ ۲۰۰۳ء میں وائٹ ہاؤس کی تیار کردہ ''دہشت گردی کے مقابلے کے لیے قومی حکمت عملی'' (National Strategy for Combating Terrorism) ہم سب اتفاق کر سکتے ہیں کہ امریکہ پر ''نظریات و افکار کی جنگ جیتنا، جمہوری اقدار کی حمایت کرنا اور معاشی آزادی کو فروغ دینا

* Daniel Byman, "How to Fight Terror", the National Interest, Spring 2005, pages. 124-130

• یہ مطالعہ درج ذیل تین کتب کے ایک تجزیاتی تبصرہ پر مشتمل ہے۔

George Friedman, *America's Secret War: Indise the Hidden Worldwide Struggle Between America and Its Enemies* (New) York: Random Hous, 2004).

Adam Garfinkle, ed., *A Practical Guide to Winning the War on Terrorism* (Stanford, CA: Hoover Press, 2004).

Rey Takeyh and Nikolas K. Gvosdev, *The Receding Shadow of the Prophet: The Rise and Fall of Radical Political Islam* (Westport, CT: Praeger, 2004).

''لازم ہے نیز ہم ''نائن الیون کمیشن'' کی اس دعوت کی بھی تصدیق کر سکتے ہیں جو امریکہ کی غلط یا ناواقفیت پر مبنی تصویر کشی کی تصحیح کے ذریعے امریکہ کی عالمی درخواست کو بہتر بنانے کے لیے دی گئی۔ لیکن عملی طور پر ان تجاویز کا کیا مقصد ہے؟ کیا لوگوں کے قلوب و اذہان کو جیتنا کیا واقعی ممکن بھی ہے؟ خاص طور پر سعودی عرب اور سوڈان جیسے ممالک میں جہاں امریکہ کے بارے میں اچھی آراء نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس سے بھی بڑی مشکل یہ ہے کہ بش انتظامیہ اور اس کے بعد آنے والی حکومتیں ان کوششوں کا دوسری امریکی ترجیحات کے ساتھ کیسے توازن قائم رکھیں گی؟ کیا مجاہدین کی موجود بے مثال دھمکی امریکہ کو عراق اور اسرائیل کے بارے میں اپنی پالیسی تبدیل کرنے پر مجبور کر دے گی تاکہ وہ ایک بڑے خطرے سے نبٹ سکے؟ یا کہ یہ بھی دوسرے خطرات میں سے ایک خطرہ ہی ہے؟

''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' سے متعلق کئی کتب بدقسمتی سے ایسے جوابات پیش کرتی ہیں جو کمزور پالیسی کی تجاویز اور دھیمے تجزیوں کے غافل کُن مجموعے ہیں۔ مثلاً جارج فریڈمین کی کتاب ایک حد تک ایسے بے لطف مطالعات کا نمونہ پیش کرتی ہے جو حالیہ سالوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔ القاعدہ کے منظر عام پر آنے سے متعلق ''نائن الیون کمیشن'' کے جچے تلے بیان، امریکہ کے اس پر ردعمل اور بہت سی خفیہ رپورٹوں کی ناکامی کے مقابلے میں ''امریکی خفیہ جنگ'' نامی رپورٹ گیارہ ستمبر سے پہلے اور بعد کے کئی بنیادی واقعات کا اکثر افسانوی اور کھوکھلا جائزہ پیش کرتی ہے مثال کے طور پر فریڈمین اس بات پر زور دیتا ہے کہ گیارہ ستمبر سے پہلے امریکی خفیہ تنظیموں کی بنیادی کمزوری انسانی مہارت اور تجزیہ کی کمی تھی۔ اگرچہ یہ ایک حقیقی خامی ہے لیکن قاری یہ تصور کرنے لگتا ہے کہ وجدان و منطق کے استعمال کے بارے میں فریڈمین کے خاص الفاظ کے مقابلے میں عربی دان تجزیہ نگار منصوبے کو بہت زیادہ منکشف کر دیتے۔ اسی طرح وہ واضح کرتا ہے کہ ''سعودی عرب میں شروع ہو جانے والی خانہ جنگی'' جو عراق پر امریکی حملہ کے باعث پیدا ہوئی یہ ایک دلچسپ بحث ہے لیکن یہ ایک ایسی بات ہے جو مملکت میں پائی جانے والی تشدد کی سطح کو ڈرامائی طور پر مبالغہ آرائی سے بیان کرتی ہے۔ فریڈمین کئی ایسے بیانات بھی پیش کرتا ہے جو بالکل غلط ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ سعودیوں کو مسئلہ فلسطین کا حقیقی علم ۲۰۰۲ء میں ہوا اور یہ کہ ولی عہد شہزادہ عبداللہ کا امن منصوبہ اس کے لیے بے خطرہ تھا۔ یہ دونوں باتیں سعودی مملکت اور اس کی سیاست

سے متعلق نمایاں جہالت کی عکاسی کرتی ہیں۔ (گریگوری گازسوئم کی کتاب A practical guide to winning the war on terrorism میں سعودی عرب سے متعلق معلوماتی اور پرمغز باب میں اس بات کا موزانہ مطالعے کا مستحق ہے)۔ سعودی عرب سے متعلق غلط بیانیاں قابل معافی ہیں کیونکہ سعودی حکمران خاندان رازداری کا بہت عادی اور ایک چیستان کی طرح ہے۔ تاہم فریڈمین امریکی پالیسی سے متعلق کچھ بے تکے اور اوٹ پٹانگ نظریات کو بھی قبول کر لیتا ہے۔ دیگر باتوں میں وہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ امریکہ کی عراق پر چڑھائی بنیادی طور پر سعودی عرب پر دباؤ ڈالنے کے لیے ہے۔ یہ بات ایسا انکشاف ہے جسے واشنگٹن اور ریاض دونوں حیرت انگیز پائیں گے۔ اس طرح کی غلط بیانیوں اور سادہ لوحی کے علاوہ فریڈمین کی کتاب مایوس کن ہے کیونکہ وہ نہ تو اپنے مابہ النزاع نکات پر کوئی حوالہ پیش کرتا ہے اور نہ ہی کسی سیاق وسباق کا تذکرہ کرتا ہے۔ جس کی بناء پر اس کے یہ نکات ''نائن الیون کمیشن'' کے ایک ہی دور کے متعلق جامع مطالعہ کے مقابلہ میں انتہائی ناقابل اعتبار بن جاتے ہیں۔

انتہائی تکلیف دہ امر یہ ہے کہ فریڈمین مشکل اور پیچیدہ سوالات کو نظر انداز کر جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ یہ سوال نہیں اٹھاتا کہ امریکہ پر دہشت گردوں کے حملوں کا ابھی تک کوئی نمایاں نتیجہ کیوں نہیں نکلا؟ یا عراقی جنگ اور اس کے عواقب پر بڑی توجہ مرکوز کرنے کے باوجود بش انتظامیہ کو عراق کے بارے میں مزید کیا اقدامات کرنے چاہئیں؟ نیز وہ مسلم دنیا میں محسوس کیے جانے والے غیظ وغضب کو دھیما کرنے اور کچل ڈالنے کے لیے کوئی سفارش پیش نہیں کرتا۔

ستم ظریفی کا عالم یہ ہے کہ فریڈمین جو "Stratfor" کا بانی ہے جو دنیا کی نمایاں پرائیویٹ انٹیلی جنس فرم ہونے کا اعلان کرتی ہے، مستقبل میں رونما ہونے والے بڑے واقعات کے بارے میں کوئی پیشین گوئی پیش نہیں کرتا۔

پھر بھی وہ لوگ جو جوابات کی تلاش میں ہیں ان کے لیے امید باقی ہے۔ کوڑا کرکٹ اور کچرے کے ڈھیروں میں کچھ قابل قدر بھی کتب نمایاں مقام پر نظر آتی ہیں جن میں سے کئی القاعدہ کے خلاف جدوجہد کے غیر معمولی پہلوؤں سے بحث کرتی ہیں اور ہمیں اپنی سوچ کو آگے بڑھانے میں مدد کرتی ہیں۔ دو انتہائی مختلف کتابیں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہیں مسلم دنیا کے بارے میں جدوجہد اور نظریات کی وسیع

جنگ سے متعلق خاص امور کی طرف ہماری توجہ مرکوز کراتی ہیں۔ پہلی کتاب ایڈم گارفنکل (Adam Grafinkle) کی زیرادارت شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب دہشت گردی کے منابع اور مصادر کا جائزہ لینے، سعودی عرب اور پاکستان جیسے اہم ممالک کی پالیسیوں کا گہرا تجزیہ کرنے، اور یورپی اور امریکی مسلم عوام کے لیے ابھرتے ہوئے چیلنجوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ عوامی سطح کی سفارت کاری کے خطرات سے متعلق کئی عمیق نکات پیش کرتی ہے۔

دوسری کتاب رے تاکیہ (Rey Takeyh) اور نکولوس گوسڈیف (Nikolas K. Gvosdev) کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس کا نام (*The Receding Shadow of the Prophet: The Rise and Fall of Radical Political Islam*) ہے۔ یہ کتاب اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ مختلف اسلامی تحریکوں نے کیسے عالمی سطح پر کامیابی کا سفر طے کیا ہے۔ مصنفین نہ صرف اسلامی جذبہ سے سرشار مشہور ممالک جیسے مصر اور الجیریا پر نگاہ رکھتے ہیں بلکہ سابق سوویت یونین اور بلقان (Balkans) میں بھی اسلامیت کے مقدر پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔

اغلاط سے خالی کوئی کتاب نہیں ہے۔ گارفنکل کی کتاب بالخصوص ان عام خامیوں سے بھری ہوئی ہے جن میں تحقیقی کتابیں مبتلا ہوتی ہیں۔ کوئی باب بھی براہِ راست ان مسائل کے بارے میں گفتگو نہیں کرتا جو دوسرے ابواب میں ذکر کیے گئے ہیں۔ موضوع سے متعلق مواد میں بھی کچھ واضح خلا ہیں۔ (گارفنکل بذات خود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بدقسمتی سے کتاب افغانستان یا مصر کی بابت مضامین سے محروم ہے)۔ معیاری ہونے میں بھی ابواب ناہموار ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود دونوں کتابیں دہشت گردوں کے خلاف جدوجہد سے متعلق غور وفکر کرنے کے لیے قابل قدر معلومات پیش کرتی ہیں جن میں سے کئی ان موضوعات کی موجودہ فہم کے برعکس جاتی ہیں۔

ان دونوں کتابوں سے ایک پیچیدہ تصویر ظاہر ہوتی ہے۔ پہلی یہ کہ قلوب واذہان کو جیتنے کی کوششیں یا اس سے زیادہ کھلے الفاظ میں یوں کہیں کہ اپنے آپ کو عالم اسلام میں بہتر طور پر فروخت کرنے کی کوششیں غیر معمولی حد تک سخت مزاحمت کا سامنا کرتی ہیں۔ بہت سی مشکلات کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر ہمیں کوئی کامیابی حاصل کرنی ہے تو کسی بھی واقعہ سے متعلق عمومی سفارت کاری کے انداز میں بڑی تبدیلیاں

لانا ضروری ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ انتہا پسند اسلام کے فوری خطرے کو نہیں بلکہ طویل المعیاد چیلنج کو بیان کرنے میں مبالغہ سے کام نہ لیا جائے۔ اسامہ بن لادن سے تعلق رکھنے والے دہشت گرد اگرچہ بہت سے لوگوں کو قتل کرنا جاری رکھیں گے لیکن ان کی ظالمانہ کارروائیوں نے ان کا ریکارڈ خراب کر دیا ہے ان کے مجموعی نظریے کی کشش یا اپیل کم ہے اور اقتدار میں اسلام پسندوں کی کارکردگی بہت مایوس کن رہی ہے۔

دلوں کو جیتنا اور ذہنوں کو تشویش میں ڈالنا

آئندہ سالوں کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ مسلم دنیا میں القاعدہ اور اس سے منسلک لوگوں کے لیے مقبول عام حمایت میں کمی کی جائے۔ اگرچہ امریکہ جنگجو طبقات کی سخت بنیاد کو تو متزلزل نہیں کر سکے گا لیکن جنگجو شاید کم رقم وصول کر سکیں گے اور لوگوں کی برائے نام تعداد اس گروہ میں شامل ہوگی بشرطیکہ ان ممالک کی اکثر آبادی میں امریکہ سے نفرت کم کرا دی جائے۔ ان خطوں کی حکومتوں کے پاس موافق رائے عامہ کے حصول کے لیے واشنگٹن سے فاصلے بڑھانے کے لیے اسباب کم ہو جائیں گے۔ امکان ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ مقامی آبادی شاید زیادہ خوشی سے جنگجوؤں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں امریکہ اور اس کی حلیف حکومتوں کے ساتھ تعاون کرے گی۔

مجاہدین کے مقاصد بالخصوص ان کے امریکہ مخالف موقف کے لیے مقبول عام حمایت کو اکثر غلط طور پر حقیقت فہمی کی بجائے غلط فہمی کا مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ امریکی اس خیال سے انتہائی بدحواس ہو جاتے ہیں کہ دہشت گرد اور ان کے حمایتی ہماری پالیسیوں سے نفرت کرتے ہوں گے۔ اس کی بجائے وہ اس یقین کو ترجیح دیتے ہیں کہ مسئلے کا بڑا حصہ غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ اگر امریکہ مزید مؤثر انداز سے اپنا پیغام پہنچائے تو مجاہدین کی حمایت تیزی سے کم ہو سکتی ہے۔ خاص طور پر مسلم دنیا یہ بات تسلیم کرے گی کہ امریکہ ظلم و استبداد کے خلاف ہے، وہ مساوات کی حمایت کرتا ہے اور عمومی طور پر وہ مسلمانوں کے ساتھ ہے۔

اسلام پسند بالخصوص عراق پر حملے کو مسلمانوں پر حملہ تصور کرتے ہیں اور یہ ایسا نقطۂ نظر ہے جو ستم ظریفی سے امریکی مشکلات کی گہرائی کو واضح کرتا ہے۔ اسلام پسندوں کے ہاں عراق میں مزاحمت بالکل

جائز سمجھی جاتی ہے جس کی تصدیق ان کی حکومت کے حامی مذہبی رہنماؤں نے بھی کی ہے کہ جو ماضی میں القاعدہ کو تنقید کا نشانہ بنا چکے ہیں۔ عراق پر امریکی حملے تقریباً پوری دنیا میں ایسی ظالمانہ کوشش سمجھے جاتے ہیں کہ جو ایک ملک کے تیل کے ذخائر پر (اسرائیل کے حکم کی تعمیل میں) دائمی تسلط کے حصول کی غرض سے کی گئی ہے۔ یہ حقیقت کہ امریکہ نے جمہوریت کے لیے سخت دباؤ ڈالا ہے اگرچہ نامکمل طور پر ہی سہی اور یہ کہ بش انتظامیہ خوشی سے عراق کو خالی کر دے گی اگر یہ ایک مستحکم یعنی جمہوری حکومت بن جائے تو یہ ایسی باتیں ہیں جن کا دور دور تک مذاق اڑایا جاتا ہے۔

ان مسائل کا واضح جواب بہتر عوامی تعلقات ہیں۔ مزید انسانی فہم وفراست کے مسلسل استعمال کے علاوہ دہشت گردی کے خلاف اقدامات کو بہتر بنانے کے لیے ''عوامی سفارت کاری'' میں تازہ ترین نئی روح پھونکنے کی بار بار دعوت ہی غالباً سب سے بہتر تجویز ہے۔ آزاد خیال اور قدامت پسند دونوں اس خیال کے علمبردار ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ تصور صرف چند قربانیوں ہی سے بہت اہم بدلے کا وعدہ کرتا ہے۔ بدقسمتی سے عوامی سطح کی سفارت کاری کے لیے ہمارا جوش و جذبہ ہماری قابلیت سے مناسبت نہیں رکھتا۔ معروف سفیر ایڈورڈ دیریجیان (Edward P. Djerejian) کی سربراہی میں کام کرنے والی ایک ٹاسک فورس نے امریکہ کی عوامی سفارت کاری کو ''ایک متروک پالیسی جو خاص سمت اور وسائل سے محروم ہو'' پایا۔

"*A Practicle Guide to Winning the War on Terrorism*" نامی کتاب عوامی سطح کی سفارتکاری سے متعلق مفید افکار و خیالات پیش کرتی ہے۔ کہ اگر ان پر کان دھرا جائے تو یہ ایک مطلوب سمت کو حاصل کرنے میں مدد کر سکتے ہیں۔ بہت سے مصنفین جو اس بات سے بحث کرتے ہیں کہ عوامی سطح کی سفاری کاری کو کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ وہ آپس میں اتفاق نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمیں عوامی سطح کی سفارتکاری کے خاص کام، اسے کرنے کے مناسب ترین مناہج اور اس کی متوقع حدود کے بارے میں متنوع بیانات کا ایک خزانہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ ان موضوعات سے متعلق سب مقالات کو جب ہم اکٹھا رکھ کر دیکھتے ہیں تو وہ مسائل کی پیچیدگی اور ایسی رکاوٹیں جن پر قابو پانے کی ضرورت ہے کی ایک تصویر ہمارے سامنے کھینچ دیتے ہیں۔

عوامی سطح کی سفارتکاری کا مسئلہ کوئی نیا نہیں ہے۔ جیسا کہ مارٹن کرامر (Martin Kramer) اپنے باب میں دلیل دیتا ہے: ''ہر غیر مسلم طاقت جس نے اپنی طاقت کا رخ مشرق وسطی کی طرف کیا ہے کو مسلمانوں کے اذہان وقلوب کو فتح کرنے کی مشکل کا سامنا رہا ہے''۔ کرامر اسلام کے لیے کا مظاہرہ کرنے احترام کے ایک مستحکم منصوبے کی تجویز پیش کرتا ہے اس کا کہنا ہے کہ اعلیٰ اسلامی خاندانوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو اپنے قریب جمع کیا جائے جو ہمارے مقصد کی توثیق اور حمایت کریں۔

یہ بظاہر سادہ منصوبہ انتہائی مشکل ہے۔ اکثر مسلمان دانشور جو انتہائی قابل اعتماد خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ حقیقت میں واشنگٹن کے خلاف صف بندی کر چکے ہیں۔ جیسا کہ کرامر واضح طور پر لکھتا ہے کہ دوست مسلمان حکومتوں سے امریکہ کو مزید پسندیدہ ملک بنانے کے لیے مدد کی امید نہیں ہے کیونکہ وفادار حکومتوں کے پاس ثابت قدم مذہبی علماء نہیں ہیں۔ بہتر ساکھ رکھنے والے اکثر بیرونی علماء امریکہ کی جانب کہیں زیادہ دشمنی کا میلان رکھتے ہیں۔

عوامی سطح کی سفارتکاری کا اس سے بھی بڑا مسئلہ ظاہری احترام کے مناسب اظہار کے لیے داخلی اور خارجی سطح پر پیغامات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی مشکل ہے جیسا کہ ولیم رو (William Rugh) زور دے کر کہتا ہے: ''واشنگٹن کے سرکاری اہل کار عوامی سطح پر بات کرتے ہوئے غیر ملکی سامعین کی بجائے صرف امریکی سامعین کے متعلق سوچ رہے ہوتے ہیں''۔ داؤد قطب (Daoud Kuttab) اور ایلن لیپسن (Ellen Laipson) جیسے لوگ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بدقسمتی سے عالمی میڈیا میں مارکیٹ اور رازوں کا مسلسل فاش ہوتے رہنا اس بات کو ناممکن بنا دیتے ہیں کہ ہم اپنے منہ کی دونوں طرفوں سے گفتگو کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ داخلی سامعین کے لیے دیئے جانے والے بیانات سمندر پار ہر جگہ بار بار سُنائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر نائب صدر ڈک چینی نے ٹیلی ویژن میں ایک انٹرویو کے دوران فلسطین سرکاری اہلکاروں کے اسرائیلیوں کے ہاتھوں قتل کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے نظر انداز کر دیا جو کہ ایک جائز موقف ہے لیکن مسلم دنیا میں اس کا بہت منفی تاثر پیدا ہوا۔ بیس سال پہلے امریکہ کے حامی ممالک میں کسی مسلمان نے نائب صدر کے ایسے بیان کو نہ دیکھا ہوتا کیونکہ حکومت کے زیر کنٹرول چلنے والا میڈیا ان بیانات کو نہ دکھاتا۔ سیٹلائٹ ٹی وی کے ذریعے وہ نائب صدر کو اصل اوقات میں دیکھ سکتے ہیں۔

امریکی ایونجلیکل لیڈر جیسے فرینکلن گراہم جس نے بش کی پہلے عہد کی تقریب میں اس کی شان میں پہلے تعریفی کلمات پیش کیے اور بعد میں اسلام پر ''برے'' مذہب ہونے کا الزام لگایا، اس کے ایسے بیانات نے بھی خاصی توجہ حاصل کی۔ یہ وہ باتیں ہیں جس کی وجہ سے امریکہ کے بیرون ممالک امریکی سرکاری اہل کاروں کو ایک ہی وقت میں اس خیال کو پیش کرنے میں مشکل پیش آئی کہ امریکہ اسلام کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

مشکل دونوں صورتوں میں پیش آتی ہے۔ کچھ مصنفین امریکہ کو اعتدال پسند مسلمان مذہبی رہنماؤں کو دوست بنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں واضح تجویز ہے۔ کئی مذہبی رہنما جو مجاہدین کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھنے والے نوجوانوں کے درمیان مقبولیت رکھتے ہیں یہود دشمن سازشوں کے منصوبوں اور عورتوں کے غیر مساوی مرتبے کی کھلی حمایت کرتے ہیں۔ کوئی بھی امریکی لیڈر جو ایسے لوگوں کو دوست بنائے گا وہ داخلی تنقید کا کھلا نشانہ بن جائے گا۔

لیکن امریکی مسئلہ عوامی سطح کی سفارتکاری سے گہرا ہے کیونکہ یہ سخت الجھے ہوئے انداز میں امریکی پالیسی سے بھی جُڑا ہوا ہے۔ اکثر مجاہدین اُن پالیسیوں کے مخالف ہیں جو امریکیوں کی نظر میں جائز ہیں۔ امریکہ اسرائیل کا مخلص اور سچا حمائتی ہے۔ (ہارورڈ ڈین کو اس وجہ سے کہ وہ امریکہ سے مزید معتدل مزاج بننے کا مطالبہ کر رہا تھا، اپنے ڈیموکریٹس ساتھیوں کی طرف سے تنقید کا سامنا کرنا پڑا)۔ اور امریکہ مشرق وسطی اور دوسرے ملکوں میں بھی مطلق العنان اور آمرانہ حکومتوں کی حمایت ترک کرتا ہے۔ یہ تمام فیصلے امریکی قوم کے مفاد میں ہیں لیکن وہ اسلحہ فروش بے چارے قابل رحم ہیں جو مسلم دنیا میں اپنا مال فروخت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان مسائل کے نتیجہ میں عوامی سطح کی سفارتکاری کا روایتی تصور تباہی کا شکار ہوسکتا ہے۔ لیپسن اس سلسلے میں اعلان کرتا ہے کہ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جو غیر مناسب وقت پر ظاہر ہوا ہے اور یہ کہ یہ ''غالباً فائدے سے زیادہ نقصان پہنچا رہا ہے''۔ تاہم حاشیوں کناروں پر کچھ جگہ ہے جیسا کہ گارفنکل ذکر کرتا ہے کہ امریکہ نے مطلق العنان عربوں کو نہ تو مقرر کیا ہے اور نہ ہی وہ ان کی جاری حکمرانی کا ذمہ دار ہے۔ اسی طرح امریکہ ایک فلسطینی ریاست چاہتا ہے مگر ایسے حالات میں جو ناممکن اور بعید از قیاس ہیں۔ سادہ الفاظ

میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ بحث مباحثہ میں مصروف رکھنا اور انتہائی درجے کی غلط فہمی کو ختم کرنے کی کوشش کرنا خیر سگالی کے جذبے کو تقویت دے گا۔ اگرچہ یہ اس سطح کا جذبہ خیر سگالی نہیں ہوگا جو امریکہ کو بہت زیادہ لائق ستائش بنا دے۔

کیا ہم کسی نہ کسی طرح جیت رہے ہیں؟

مندرجہ بالا میں پیش کی گئی عوامی سطح کی سفارتکاری کی تصویر بہت دھندلی ہے۔ عام تاثر یہی پایا جاتا ہے کہ بن لادن اور اس کے پیروکار اس طوفانی لہر کی بلندی پر پہنچ گئے ہیں جو شرق اوسط کو ڈبو رہی ہے، یورپ کے ساحل سے ٹکرا رہی ہے اور امریکہ میں بھی پہنچ رہی ہے۔

پھر بھی انتہا پسند اسلام کے تشدد اور اس کی داخلی جاذبیت اور ربط کے درمیان ایک خط امتیاز ضرور کھینچنا چاہیے۔ ڈینیئل بیل (Daniel Bell) نے ۱۹۶۰ء میں *The End of Ideology* شائع کی اور واضح کیا کہ مغربی آزاد جمہوریت نے کمیونزم پر فتح پالی ہے۔ یقیناً یہ ایک ایسا نقطۂ تھا جو بعد میں کیوبا کے میزائل پروگرام کے التواء، ویتنام میں اچانک مکمل ناکامی اور دوسرے بحرانوں کے دوران بڑا عجیب معلوم ہوتا تھا۔ تاہم جب دیوار برلن زمین بوس ہوگئی تو بیل کے نظریے کی تصدیق ہوگئی۔ کمیونزم حقیقتاً اپنی طاقت کھو چکا تھا اور اگر پیچھے مڑ کر دیکھیں تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ کمیونزم کے خاتمے کا عمل دراصل عشروں پہلے شروع ہو چکا تھا۔

سیاسی اسلام پر تحقیق کرنے والے دو نمایاں اسکالرز اولیور رائے (Olivier Roy) نے ۱۹۹۴ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب *The Failure of Political Islam* (سیاسی اسلام کی ناکامی) اور گلز کیپل (Gilles Kepel) نے ۲۰۰۰ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب *Jihad: The Train of Political Islam* (جہاد: سیاسی اسلام کی گاڑی) میں گزشتہ عشرے میں ایک جیسے دلائل پیش کیے۔ انہوں نے زور دے کر کہا ہے کہ سیاسی اسلام اپنی حکیمانہ قابلیت کھو چکا ہے۔ اس لیے جب بھی اسے کہیں طاقت ملی ہے تو اس نے خود کو ناکام ثابت کیا ہے۔ گیارہ ستمبر کے واقعہ نے اس دلیل کو حقائق سے ناواقفیت پر مبنی ثابت کیا ہے لیکن بنظر غائر مطالعہ جو تاکیہ اور گوسڈیف نے پیش کیا ہے وہ اس کے برعکس

ہے۔

شاید اس نقطۂ نظر کو سمجھنے کا بہترین طریقہ دنیا کو ان نگاہوں سے دیکھنا ہے جن سے مجاہدین کی ہمدرد نگاہیں القاعدہ کو دیکھتی ہیں۔ تاکیہ اور گوسڈیف ایران، الجیریا، مصر، سوڈان، افغانستان اور سابق یوگوسلاویہ میں اسلامی تحریکوں کے عروج وزوال کا تعاقب کرتے ہیں اور یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان ممالک میں جب بھی اسلام پسندوں کے پاس پیروکاروں کی بھاری تعداد تھی اور بعض اوقات جب انہیں اقتدار بھی مل گیا تو عموماً انہوں نے سیاسی تحریکوں میں خود کو نالائق اور نکما ثابت کیا ہے۔ جیسا کہ یہ مصنفین کہتے ہیں: ''یہ بالکل واضح ہے کہ انتہاء پسند سیاسی اسلام خود بھاری اکثریت کے مسلم خطوں میں بھی جدید یا جدیدیت پسند ریاستوں کا کنٹرول نہیں سنبھال سکتا اور نہ ہی حکومت کے ایک مؤثر متبادل نمونہ کی تعمیر کرسکتا ہے''۔

الجیریا اسلام پسندوں کی ایک انتہائی ڈرامائی انداز سے ناکامی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں الجیریا کی فوجی قیادت نے باضابطہ انتخابات کے ذریعے قوت حاصل کرنے والے اسلامک سالویشن فرنٹ کو روکنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا۔ اس پر ملک کے اندر عوامی مظاہرے اور بیرونِ ملک مذمت ہوئی۔ یہ اس بات کا پیغام تھا کہ فوجی حکومت ملک کی بنیادیں کھوکھلی کر رہی ہے۔ تاہم آرمڈ اسلامی گروپ (GIA) جس کے اکثر اراکین سوویت یونین کے خلاف افغانستان میں برسرپیکار رہ چکے تھے نے فرنٹ کی حصول اقتدار کے متعلق بے بنیاد امیدوں کی مذمت کی اور اس لیے بھی کہ وہ جمہوریت کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ جی آئی اے نے فوری طور پر تشدد کا راستہ اختیار کیا اور حکومتی ارکان، دانشوروں اور دیگر مزعوم دشمنوں کو نشانہ بنایا۔ جی آئی اے کے جنگجو ظلم کی ناقابل بیان کارروائیوں میں ملوث تھے جس میں بچوں اور حاملہ عورتوں کا قتل بھی شامل تھا۔ اور یہ ایسے کام تھے جنہوں نے خود کئی سچے نظریاتی جہادی کارکنوں کا بھی رنگ اڑا دیا۔ ایک لاکھ سے زائد افراد موت کا شکار ہوئے جس سے اسلامی اہداف کی ساکھ بے حد متاثر ہوئی۔ نتیجہ یہ کہ بدعنوان اور بداخلاق حکومت نے جواز حاصل کرلیا ہے کیونکہ بہت سے الجیرین بشمول کئی روشن خیال اسلام پسندوں نے جی آئی اے اور اس سے متعلقہ گروپوں کو مایوس وحشی سمجھ لیا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ اقتدار میں موجود اسلام پسند اسلامی تحریک کی ساکھ ختم کرنے کے لیے

امریکہ کی امیدوں کا بہترین وسیلہ ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ گراہم فُلر نے ۲۰۰۳ء میں شائع شدہ اپنی کتاب *The Future of Political Islam* ''سیاسی اسلام کا مستقبل'' میں اپنا مشاہدہ پیش کیا ہے کہ:

''اقتدار میں موجود ایک ناکام محدود گروہ کے مقابلے میں کوئی چیز بھی اسلام پسندی کو زیادہ تیزی سے قابل نفرت نہیں بنا سکتی''۔ سوڈان میں اسلامی حکومت جسے فوجی رہنماؤں نے ہٹا دیا تھا اور طالبان کا افغانستان دونوں ایسی مثالیں ہیں جن میں اسلام پسندوں نے اسلام کے نام پر جبرًا قوت حاصل کی۔ صرف ایک بار کے اقتدار میں ان کے کرتوتوں نے خود ان کی اور ان کے اہداف کی ساکھ ختم کر دی ہے۔

ایران ایک ایسی صورت حال کو پیش کرتا ہے جس میں فتح یاب اسلام پسند حکومت کا نظریہ پسپائی کا شکار ہے۔ ۱۹۷۹ء میں آیت اللہ خمینی مقبول عام جوش کی ایک لہر کے سہارے اقتدار میں آ گیا۔ اگرچہ وہ جمہوریت پسند نہیں تھا پھر بھی اس کی حکومت کو اس کی غیر معمولی ذہانت، قومیت کے حوالے سے اس کی قابلیت اور دینی اعتماد اور ساکھ کی وجہ سے عالمگیر شہرت و حمایت حاصل ہو گئی۔ ۱۹۸۹ء میں خمینی کی موت اور بعد ازاں تیسرے درجے کی دانش کا حامل آیت اللہ خامنائی جس نے خمینی کی جگہ اقتدار سنبھالا، نے مذہبی حکومت کے جواز پر سیاست کی فتح کی مہر لگا دی۔ جب معاشی بدانتظامی اور آٹھ سال عراق کے ساتھ لاحاصل قربانیوں کے برے انجام کا امتزاج ہوا تو حکومتی نظریے کا منہ کالا ہو گیا۔ ۱۹۹۷ء میں محمد خاتمی نے جزوی طور پر عام انتخابات جیتے۔ اس نے مزید سیاسی کثریت (Pluralism)، انفرادی آزادی اور قانون کی حکمرانی کے زیادہ احترام کی دعوت دی۔ ان سب نکات نے اس وقت موجود نظام کو چیلنج کیا۔ ۲۰۰۴ء میں قدامت پرست ایک مرتبہ پھر ابھر کر منظر عام پر آئے لیکن یہ ایک سیاسی جیت تھی نہ کہ نظریاتی۔ انقلاب کا جواز تیزی سے کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے۔ ایران کے سنجیدہ مذہبی سکالرز یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ مذہبی دورِ حکومت نے ملک کو نقصان پہنچایا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر سے اس سے اہم بات یہ ہے کہ اس دور کی حکومت نے اسلام کو اس سے بھی زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ ایران کے قدامت پرست طبقے سے تعلق رکھنے والے مخلص مؤمنین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انہیں اپنے نظریہ کو بہتر بنانے کے لیے اس پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ آج ایران میں سیاسی اسلام کو چالیس سال پہلے کے مقابلے میں کم مقبولیت حاصل ہے جبکہ امریکہ کو وہاں ان عرب ممالک سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے جن کی حکومتیں واشنگٹن کی حلیف ہیں۔

کئی طریقوں سے انتہاء پسند اسلام کی ایک سیاسی تحریک کی حیثیت سے گہری ناکامی یہ ہے کہ یہ دہشت گردی کا منبع ہے اور بہت خطرناک ہے۔ انقلابی اسلام پسندوں کی مشکل یہ ہے کہ وہ پرامن تبدیلی کے لیے سیاسی نظام کو استعمال کرنا چاہتے ہیں کیونکہ بہت سے لوگ ان کی مقبولیت کی حدود جانتے ہیں۔ درحقیقت سیاسی عمل کسی بھی تحریک میں دھڑے بندیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ نیز یہ اختلافات کو ہوا دینے والے دھڑوں کو اسلام پسندوں کے ایسے متنوع گروہوں سے جدا کرسکتا ہے جو شدت وانتہا پسندی کی حمایت نہیں کرتے۔ تشدد پسندی کو قبول کرنے سے انتہا پسند اس ناکامی سے محفوظ رہتے ہیں جو شاید پرامن سیاسی شرکت سے ان کا مقدر بن سکتی ہے۔

عام لوگوں کے لیے انتہا پسند اسلام میں کم کشش (appeal) ہے۔ اس کے مضمرات اس سوال کے لیے بہت گہرے ہیں کہ آیا امریکہ کو جمہوریت کو ترقی دینی چاہیے؟ جمہوریت کے فروغ کے لیے اکثر سنی گئی تنقید یہ ہے کہ یہ اسامہ بن لادن کے ساتھیوں کو تو طاقتور بنادے گی لیکن تھامس جیفرسن کے پیروکاروں کو نہیں۔ تاہم اگر تاکیہ اور گوسڈیف کی رائے کو درست مان لیا جائے تو قانون کی حکمرانی کے فروغ اور شفاف انتخابات کے ذریعے سے انتہاء پسند آراء غالباً ختم ہوجائیں گی۔ وہ لوگ جو اقتدار حاصل کرلیں گے ضروری نہیں کہ وہ واشنگٹن کے دوست ہوں لیکن بدترین اور ڈراؤنا خواب یعنی انتخابات کے ذریعے مجاہدین کا پرامن طریقے سے ملک کی باگ ڈور سنبھالنا بہت بعید از قیاس ہے۔

تاکیہ اور گوسڈیف کی دریافتیں یہ تجویز بھی پیش کرتی ہے کہ امریکی خارجہ پالیسی کو القاعدہ اور انتہاء پسند مسلمانوں کے مسئلے پر بھی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ کیونکہ انتہاء پسند مسلمانوں کا نظریہ شاید پسپائی کا شکار اور ان کی کشش محدود ہوسکتی ہے۔ امریکہ ایک ایسے دشمن کا سامنا کررہا ہے جو اکثر خود اپنے آپ کو شکست دے دیتا ہے۔ جہادیوں کے اپنے پروگرام کی دعوت کی کمزوری شاید امریکہ کے لیے بہترین موقع فراہم کرتی ہے۔ گوکہ مسلم دنیا میں امریکہ کے بارے میں رائے بہت مایوس کن ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تشدد کی وکالت کرنے والوں کو حمایت حاصل ہے۔

مؤثر عوامی سفارت کاری کے ذریعے امریکہ ان تحریکوں کی قبولیت عامہ کو مزید کم کرسکتا ہے۔ بنیادی بات یہ کہ امریکہ کے لیے محبت بے شک حاصل نہ ہو مگر ہمارے دشمن کے لیے حقارت ونفرت میں

اضافہ ہو جائے۔ اس سے یہ اگرچہ واضح نہیں ہوگا کہ امریکہ مسلم دنیا کے خفیہ دوست کی حیثیت سے مصروف کار ہے لیکن اس طریقے سے بڑی آسانی سے انتہاء پسند مسلمانوں کی ظالمانہ کارروائیاں ضرور واضح ہوں گی اور اقتدار کے اندر اور باہر ان کا لائق نفرت ریکارڈ سامنے آئے گا۔

[ڈیننل بائمان جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے سکول آف فارن سروس میں سیکورٹی سٹڈی پروگرام کے اسسٹنٹ پروفیسر ھیں اور بروکنگ انسٹی ٹیوشن میں سبان سنٹر فار مڈل ایسٹ پالیسی کے لیے سینئر رکن ھیں]۔